گُمانِ یقیں
جاوید شیدا

برادرِ عزیز جاوید شیدؔا جتنے اچھے دوست ہیں اتنے ہی اچھّے شاعر ہیں۔ سادگی اور سلاست، محبت اور نفاست ان کی شخصیت کا خاصہ ہے تو ان کی شاعری بھی انہی صفات سے مزّین ہے۔ شہر کے کسی گوشے سے اگر موتیے اور سفید گلاب کی مہک آ رہی ہو تو سمجھ لیجے یہ جاوید شیدؔا کی گزرگاہ ہے۔ ہم عصر شعراء میں ایک ممتاز مقام رکھنے کے باوجود طبیعت کے عجز نے اُن کے فن کو اور نکھار دیا ہے۔ یقین اور گمان کے سنگم پر، ہجر اور وصال کے دوراہے پر محبت اور دوستی کی روشنی سے منوّر کرتی ہوئی جاوید شیدؔا کی شاعری اس زمانے اور آنے والے زمانوں میں زندہ رہنے کے لیے لکھی گئی ہے۔

خالد شریف

ماورا

لاہور

خدمت برائے چغتائی پبلک لائبریری لاہور

بصد خلوص!
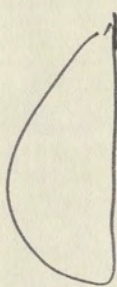
۱۵/۱/۲۰۲۳

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

گمانِ یقیں

جاوید شیدا

ضابطہ

کتاب: "گمانِ یقیں"

شاعر: جاوید شیؔدا

حرفِ شکر: بنام والدہ محترمہ

ناشر: حِسان جاوید چوہدری

شرفِ تلمذ: سعید قریشی

کمپوزنگ: محمد سجاد

سرِ ورق: محمد فرخ جاوید

اشاعتِ اوّل: ۱۴ اگست ۲۰۱۲ء

تعداد: ۱۰۰۰

قیمت: ۳۰۰ روپے (۱۰ امریکی ڈالر)

ای میل: javaidshaida@gmail.com

+92 ۳۰۰-۸۰۲۰۸۷۵

انتساب

اُس گُمان کے نام جس نے یقِین کی طرف گامزن کیا۔

فہرست

رنگ اور خوشبو کا شاعر

غزل کو اگر شعور کی معراج کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے یہ وہ گلستان ہے جس میں ہر رنگ کے پھول کھلتے ہیں اور ہر طرح کی خوشبو آتی ہے، اس میدان میں نکلنے والوں کی تعداد یوں تو لاکھوں میں ہے مگر منزلِ مقصد پر پہنچنے والے خوش نصیبوں میں سب شمار نہیں ہوتے۔ جاوید شیداؔ کی غزل کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہاں کیفیات کی کارفرمائی پوری آب و تاب سے نہ صرف موجود ہے بلکہ ہر حرف شہنائی کی طرح کانوں میں رس گھولتا ہے۔اُنہوں نے جس شانِ بے نیازی سے غزل کی مانگ میں تصوف کا رنگ بھرا ہے وہ اُن کی طبع حلیم اور جذبہ ایثار کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔شعر کی روانی اور آسان زبان محبت اور عظمت کی پہچان کا وسیلہ ہوتی ہے۔اس حوالے سے " گمانِ یقین" کے شاعر ہر ذی شعور کی جانب

سے مبارک باد کے قابل ہیں۔ اچھوتے مضامین مناسب پیرائے میں رونق افروز ہیں اور یہی خوبی شاعر اور شاعری کی جان قرار پاتی ہے۔ مشکل زمینوں میں آسان شعر کہنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ جدّت اور روایت کی سرحد پر کھڑے ہوئے شاعر جاوید شیداؔ آنے والی نسلوں کے لیے ادبی حوالے سے مشعلِ راہ ہیں۔ میں ان کی مزید کامیابی کے لیے دُعا گو ہوں۔

اقبال راہیؔ

گمان سے یقین تک کا سفر

" گمانِ یقیں " اُس شاعر کا شعری مجموعہ ہے جو خود شیدا ہیں۔ اس مجموعہ کلام میں غزل کے پھولوں کی مہک بھی ہے اور تازگی بھی۔ جاوید شیداؔ ایک متحرک انسان ہیں، وہ ہر لمحے کسی نہ کسی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ اُن کے سینے میں حسّاس اور دردمند دل دھڑکتا ہے، جبکہ اُن کے خون میں لاہور کی صدیوں پرانی ریت روایت دوڑتی ہے۔ وہ ملنسار بھی ہے اور غم گُسار بھی۔ صُوفیاء سے عقیدت اور محبت نے اِنہیں عجز وانکسار کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے اور یقین سے گمان اور گمان سے یقین تک کا سفر وہ اِسی ترنگ میں طے کر رہے ہیں۔ مجھے دلی خوشی ہے کہ جاوید شیداؔ کا اردو شاعری کا تازہ مجموعہ شائع ہو رہا ہے جو یقیناً اپنے قارئین میں سندِ پزیرائی حاصل کرے گا۔

ڈاکٹر ناہید شاہدؔ
اورینٹیل کالج لاہور

اپنی کھوج میں گُم

اگر کسی تمہید کے بغیر لکھوں تو ''گمانِ یقیں'' کے مصنّف سے کم و پیش تین دہائیوں سے قریبی تعلق ہے لہٰذا یقین ہے کہ جاوید شیداؔ کا ہر گمان یقین کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ میں نے اکثر اسے اپنی ہی کھوج میں اپنے رُوبرو پایا ہے اس شخص کو دیکھ کر یہ گمان بھی یقین میں بدل جاتا ہے کہ تخلیق کار یا قلم کار تھکان سے چُور بدن میں بھی رُوح تازہ ہی رکھتا ہے یہ حرف شناس و خوش گفتار شخص زرخیز ذہن کا مالک ہے۔ شیداؔ اپنے فکری نظام کو بہت محنت سے سنوارتا اور تخلیقی اظہار کو محبت سے نکھارتا ہے۔

یہ شاعر اپنے تخلیقی اثاثے پر کبھی مسرور نظر آتا ہے اور کبھی انکسار سے نظریں جھٹکا لیتا ہے کبھی شدت سے اپنے ہونے کا اصرار کرتا ہے اور کبھی اِک صُوفی کی طرح گریزاں نظر آتا ہے گویا اس کی ذات تصوّف کا آنچل

اوڑھے ہوئے رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ شاعری میں بھی ہم کلامی کی صورت صوفیانہ رنگ نظر آتا ہے۔ مثلاً

خار و خس پہ نہ ایسے ٹال مجھے
میرے پھولوں پہ کر بحال مجھے

جاں کو آنے لگی ہے قیدِ بدن
اِس قفس سے ذرا نکال مجھے

ان شاءاللہ یہ مسودہ ادبی لائبریری کا اثاثہ تصور ہوگا۔

کامران لاشاریؔ

سیدھے سبھاؤ کی شاعری

جاوید شیدؔا کی شاعری سیدھے سبھاؤ کی شاعری ہے یعنی کھلی آنکھ پر بیتنے والے واقعات وحادثات کو دل کی کھٹالی سے گزارا اور روشنائی کا تڑکا لگا کر قارئین کے رُوبرو رکھدیا۔ اس طریقِ سُخن کو اختیار کرتے ہوئے شاعر کو گو نہ آسانی کے ساتھ ایک نوع کی دُشواری بھی درپیش ہوتی ہے۔ آسانی تو یہ کہ شاعر لمبے چوڑے علمی اور ذہنی کھکھیڑ سے بچ جاتا ہے اور دشواری یہ کہ "ہل مِن مزید" کی عِلّت میں مُبتلا قاری کی تہذیبی نشاط واطمینان کیسے بہم ہو۔ تعلقات عامہ کے شعبے سے طویل وابستگی کے باعث جاوید شیدؔا کو مختلف سطحوں اور متضاد مطالبات رکھنے والوں سے نپٹنا خوب آگیا ہے جس کی نمایاں مثال اُس کا تازہ شعری مجموعہ "گمانِ یقیں" ہے۔ بظاہر سادہ بیان لیکن جہاں تہاں گہرے شعری احساس اور تہذیبی شعور سے مملو۔ بانگی ملاحظہ فرمایئے:

جاں کو آنے لگی ہے قیدِ بدن
اس قفس سے ذرا نکال مجھے

کہہ رہی ہے چمک یہ پانی کی
جھیل میں چاند کو اُترنا ہے

راہِ حق پر چلا تو مجھ پہ کھُلا
میرا مرنا ، عدُو کا مرنا ہے

یہ ضرور ہے کہ جاوید شیدؔا روایت کی زُلف کا والا ہے اور اپنی غزل کی دلپذیری کیلیئے اسی حرافہ کی قدم بوسی کو اصل ایمان سمجھتا ہے لیکن کسی بلند آہنگ انحراف کا پرچم بلند کیے بغیر موجود میں لپٹا ہوا نمعلوم کھوجنے سے بھی گریز نہیں کرتا جس کی چند مثالیں اوپر بیان کیے گئے اشعارہ سے ہویدا ہیں۔ مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے اُس نے چند نظمیں بھی تازہ مجموعہ میں شامل اشاعت کی ہیں لیکن صاف ظاہر ہے کہ غزل ہی اُس کی پہلی اور غیر مشروط محبت ہے اور آپ جانیں محبت میں حساب کتاب ہوتا ہے نہ طول وعرض۔ بس مُخلصانہ عرض ونیاز ہوتا ہے اور یہی مخلصانہ عرض ونیاز " گُمانِ یقین " کا کُل اثاثہ ہے۔

حُسین مجروحؔ

نعت

جو پائے تُو نے کمال آقاؐ
نہیں ہے تیری مثال آقاؐ

بنا دے ویسا مجھے ، تھا جیسا
غلام تیرا بلالؓ آقاؐ

نصیب کس کو بھلا ہوا ہے؟
وہ تُجھ سا جاہ و جلال آقاؐ!

بہت کٹھن ہیں جہاں کے رستے
میں گِر نہ جاؤں، سنبھال آقاؐ

جو دیکھے، شرمائے حُسنِ یوسفؑ
تمہارا حُسن و جمال آقاؐ

یہ آرزو ہے کہ تیرے در پر
میں آکے ڈالوں دھمال آقاؐ

کہ میں بھی ہوں بس تمہارا شیدا
مرا بھی رکھنا خیال آقاؐ

نعت

کاش میری بھی ایسی قسمت ہو
گنبدِ سبز کی زیارت ہو

میرے خوابوں میں بھی کبھی آجائیں
مجھ کو بھی خُلد کی بشارت ہو

خاک ہو جاؤں میں مدینے کی
میری تقدیر میں بھی رفعت ہو

تم بُلالو جو ایک بار مجھے
پھر کسی چیز کی نہ حسرت ہو

کیا عجب ہے کہ اس جہان کے بعد
اُن کی جنت میں بھی نبوّت ہو

سر کے بل آؤں میں تری جانب
تیری جانب سے گر اجازت ہو

میں بھی شیدآ، ہوں اُن کا شیدائی
اوج پر کیوں نہ میری قسمت ہو

سلام

گزری کس امتحان سے آلِ عبا
آنکھ پُر نم ہے تار تار قبا

موت ہاری تھی زندگی سے جہاں
ہاں ، وہی سر زمینِ کرب و بلا

غم زدوں کے ہیں غمگسار حُسین
ابنِ زہرہؓ ، وہ سید الشہداء

عرش والے تھے منتظر اُس کے
جو یہاں دھول میں اٹا ہوا تھا

دِل پہاڑوں کے بھی دہل جاتے
دیکھ لیتے جو حال اصغر کا

منقبت

(بحضور حضرت داتا گنج بخشؒ)

تو آلِ نبی اولادِ علی تُو ولیوں میں ممتاز ولی
ہے چرچا تیرا گلی گلی
تُو ہے ابنِ عثمان علی

جو تیرے منگتے بنتے ہیں سر فخر سے اُن کے تنتے ہیں
ہر مشکل اُن سے ٹلی ٹلی
تُو ہے ابنِ عثمان علی

تُو بخشے گنج گداؤں کو سُنتا ہے سب کی صداؤں کو
ہر بُری بنائے بھلی بھلی
تُو ہے ابنِ عثمان علی

تُو فیضِ عالم داتا ہے میرا بھی تجھ سے ناطہ ہے
میں خالی جھولی لے کے چلی
تُو ہے ابنِ عثمان علی
تُو غوث بھی ہے ابدال بھی ہے مجبوروں کا لجپال بھی ہے
ٹکڑوں پہ تیرے پلی پلی
تُو ہے ابنِ عثمان علی
تُو مطرب دل کے ساز کا ہے تُو واقف ہر اک راز کا ہے
کر اُن کی قسمت بھلی بھلی
تُو ہے ابنِ عثمان علی
اب مجھ کو اپنی دید کرا اِن اکھیوں کی بھی عید کرا
میں ہجر کی آگ میں جلی جلی
تُو ہے ابنِ عثمان علی

غزل

گمانِ یقیں سے یقینِ گماں تک
رسائی ہے میری کہاں سے کہاں تک

میں اِک ایسا ذرہ ہوں اپنی زمیں کا
ہے جس کی رسائی سدا آسماں تک

تجھے بھول پایا نہیں اس لیے بھی
ترا حُسن دیکھا ہے حسنِ بیاں تک

میں رنج و محن میں جو ثابت قدم ہوں
یہ سب مہربانی ہے اُس مہرباں تک

اگر ہم نہ سمجھے ہواؤں کے تیور
مٹا دے گا موسم ہمارا نشاں تک

جہاں ہر طرف اُس کے جلوے ہیں رقصاں
میں پہنچا ہوں لے کے نظر کو وہاں تک

میں اُس ذات کا ایک شیدا ہوں یارو
ہے پھیلاؤ جس کا زمیں آسماں تک

غزل

خار و خس پہ نہ ایسے ٹال مجھے
میرے پھولوں پہ کر بحال مجھے

جاں کو آنے لگی ہے قیدِ بدن
اِس قفس سے ذرا نکال مجھے

اِک عجب سر خوشی سی ہوتی ہے
جب بھی آئے ترا خیال مجھے

دشتِ فرقت میں گھنگھروؤں کے سوا
ڈالنی پڑ گئی دھمال مجھے

مجھ پہ ہونے لگے گماں تیرا
ایسے سانچے میں اب کے ڈھال مجھے

میں نے دیکھا ہے جس طرف، انساں
نظر آئے ہیں خال خال مجھے

لڑکھڑانے لگا ہوں میں شیداؔ
گِر نہ جاؤں کہیں ، سنبھال مجھے

غزل

ہوتی ہے بے زُبان ، زُباں بھی ، کبھی کبھی
جیسے کہ بے اثر ہو فغاں بھی، کبھی کبھی

پوری ہو ہر طلب یہ ضروری نہیں ہے دوست
اُٹھتا ہے یاسِیّت کا دُھواں بھی، کبھی کبھی

ہوتی ہے کارِ گردشِ حالات میں کمی
چلتا ہے ساتھ ساتھ جہاں بھی ، کبھی کبھی

مجبور ہم فقیر ہوئے ہیں تو کیا ہُوا
بے بس ہوئے ہیں شاہِ زماں بھی، کبھی کبھی

جلتے ہیں رفتہ رفتہ چراغِ دل و نظر
ملتی ہے دشتِ شَب میں اماں بھی، کبھی کبھی

ہوتا ہے یہ بھی دوستو سجدوں کے ساتھ ساتھ
ماتھے پہ آئیں داغِ نہاں بھی، کبھی کبھی

شیداؔ ، جو رنج و غم پہ ہمیشہ رہا خموش
کھُلنے لگی ہے اُسکی زُباں بھی، کبھی کبھی

غزل

بے سبب یونہی جاگتے رہنا
سُوئے دیوار دیکھتے رہنا

جھانک کر بے صدا دریچوں میں
رہ کے خاموش دیکھتے رہنا

ایک تھے ہم ، تو دو ہوئے کیسے؟
روز یہ راز کھوجتے رہنا

بند آنکھوں سے ، روزنِ دِل سے
رات بھر تُجھ کو دیکھتے رہنا

اُس کو دِل میں چھُپا کے رکھنا اور
پھر جہاں بھر میں ڈھونڈتے رہنا

حاصلِ زندگی ہُوا اپنا
تیری یادوں سے کھیلتے رہنا

جب کبھی دیکھنا کمی تیری
شیدؔا خود کو ہی کوستے رہنا

غزل

اندھیری رات میں تارا دکھائی دیتا ہے
نزولِ حق کا اشارہ دکھائی دیتا ہے

مرے حبیب بھلا میں کہاں ہوں اس قابل
کرم تمام تمہارا دکھائی دیتا ہے

یہی تو اصل منافع ہے میری جان مرا
جو دیکھنے میں خسارہ دکھائی دیتا ہے

ٹھہر گیا ہے جو لمحہ تمہاری فرقت کا
دل و نظر پہ شرارا دکھائی دیتا ہے

تمہارا ساتھ میسّر ہُوا ہے جب سے ہمیں
ہر اِک شخص ہمارا دکھائی دیتا ہے

وبالِ جاں جسے سمجھا تھا اب وہی ہم کو
قدم قدم پہ سہارا دکھائی دیتا ہے

سفر میں ایسے بھی ہوتے ہیں معجزے شیداؔ
بھنور بھی ہو تو کنارہ دکھائی دیتا ہے

غزل

ایسا بھی اِک سِتارہ سرِ آسمان تھا
جِس پر جہاں کو حُسنِ سحر کا گمان تھا

میرے تمام نقش اُسی نے اُلٹ دیئے
وہ آئینہ جو مجھ پہ بڑا مہربان تھا

رنگ و مہک تھے سانس میں سر سبز تھی حیات
جب تک میں اپنے آپ میں اک خاکدان تھا

اِک عمر میرے سائے میں بیٹھا ہے یہ جہاں
میں بھی کبھی فلک کی طرح سائبان تھا

اب تو بدل گیا ہوں میں مٹی کے ڈھیر میں
جب تک وہ میرے ساتھ تھا میں اک چٹان تھا

مجھ کو اے شیدؔا رزقِ زمیں نے کِیا ہے پست
ورنہ میں اپنی ذات میں اک آسمان تھا

غزل

جِسم پر ایک پَر نہ رہنے دے
مجھ کو جو بے ہُنر نہ رہنے دے

یہ جو دیوار ہے زمانے کی
مجھ کو محوِ سفر نہ رہنے دے

وہ جو معمور ہے سحر کے لئے
کہیں حسنِ سحر نہ رہنے دے

جو بھی کھولے زباں، امیر وطن
اُس کے شانوں پہ سر نہ رہنے دے

مجھ کو دیتا ہے جب وہ اِذنِ سفر
راستے میں شجر نہ رہنے دے

وہ جو اندر کی روشنی ہے مری
وہ مجھے بے بصر نہ رہنے دے

جس طرف ہے سکُونِ جاں شیدا
وحشتِ دل اُدھر نہ رہنے دے

غزل

اک یہی کام مجھ کو کرنا ہے
گردشِ وقت کو بدلنا ہے

اِک طرف رکھ کے اپنے خدوخال
تیرے سانچے میں مجھ کو ڈھلنا ہے

جب تلک دِن نکل نہیں آتا
صورتِ دیپ مجھ کو جلنا ہے

کُھلنے والے ہیں قفل ہونٹوں کے
ایسا ہونا ہے، ایسا ہونا ہے

سوچنے لگ پڑی ہے خلقِ خدا
کب تلک اور ہم کو رونا ہے

باندھ لے سر پہ وہ کفن شیدآ
میر ے ہم راہ جس کو چلنا ہے

غزل

اِس قدر اختیار مانگتے ہیں
اپنا بس اعتبار مانگتے ہیں

ہم چراغوں سے ظلمتِ شب کا
دامن تار تار مانگتے ہیں

ہم وہ پاگل ہیں پھول دے کر جو
باغبانوں سے خار مانگتے ہیں

اِک نگاہِ کرم اِدھر بھی ہو
بس یہی چشمِ یار مانگتے ہیں

جب سے وہ ہم کو مل گئے شیدؔا
لذتِ انتظار مانگتے ہیں

غزل

جائزہ نہیں لیتا آدمی اگر اپنا
ساتھ چھوڑ جاتی ہے منزلِ سحر اپنا

ظُلم ہو کہیں پر بھی درد ہم کو ہوتا ہے
ٹکڑے ٹکڑے پایا ہے اِس لیے جگر اپنا

فائدہ اُٹھاتا ہے سادگی سے وہ میری
جِس کو بھی بنایا ہے میں نے ہمسفر اپنا

اِک ترے تصوّر نے آنکھ کو کیا روشن
اِک ترے گماں سے ہے دِل یہ معتبر اپنا

وہ جو شیدا جذبوں کو راہبر بناتا ہے
وقت کب گنواتا ہے وہ اِدھر اُدھر اپنا

غزل

جب ترا غم بھلانے لگتے ہیں
ہم بہت ٹوٹ جانے لگتے ہیں

جب بھی ہوتی ہے روشنی دل میں
وہ ستارے بُجھانے لگتے ہیں

یہ جو غم ہیں تری جدائی کے
خاک میری اُڑانے لگتے ہیں

اُڑنے لگتے ہیں ہم فلک پہ، جوں
اُس نظر میں سمانے لگتے ہیں

لب پہ شیدؔا جب اُس کا نام آئے
لوگ باتیں بنانے لگتے ہیں

غزل

مر کے خوابوں سے نکل جائیں گے، زندہ ہونگے
زندگی اصل میں ہم پائیں گے ، زندہ ہونگے

ہم ابھی دہر کی ظلمات میں اِس پار ہیں گُم!
ہم جو اُس پار نکل جائیں گے، زندہ ہونگے

جھولیاں جائیں گے بھر بھر کے سبھی اہلِ وفا
سانس خیرات میں سب پائیں گے،زندہ ہونگے

چلتی پھرتی ہُوئی لاشوں کے سِوا کچھ بھی نہیں
لوگ جب پیار کو اپنائیں گے، زندہ ہونگے

ورنہ یہ موت نہیں دوستو ٹلنے والی
موت کے ساتھ جو ٹکرائیں گے، زندہ ہونگے

راہِ اُلفت میں یہی بات تو طے ہے شیدؔا
زخم کھائیں گے جو مُسکائیں گے، زندہ ہونگے

غزل

محورِ سوچ کو بدل کے دیکھ
ذات کے خول سے نکل کے دیکھ

زندگی کتنی خوبصورت ہے
دو قدم میرے ساتھ چل کے دیکھ

یہ بھی ممکن ہے دن نکل آئے
اِن چراغوں میں تُو بھی جل کے دیکھ

سوچ اپنے وجود سے آگے
آج میں خواب اپنے کل کے دیکھ

دے گی آواز تجھ کو خود منزل
راہِ دشوار میں سنبھل کے دیکھ

میں ہوں تیرا فقط ترا شیدا
میری جانب کبھی نکل کے دیکھ

غزل

ہر گھڑی اِک نئے کمال میں ہے
پھر بھی یہ آدمی زوال میں ہے

کیا عجب ہے کہ تجھ کو کھو کر بھی
لمحہ لمحہ مرا وصال میں ہے

مجھ کو رکھتا ہے تیغ کی صُورت
یہ جو اِک زخم میری ڈھال میں ہے

تُو نے اِتنا بھی کب پتہ رکھا
ترا دیوانہ کیسے حال میں ہے

کیا یہ نمرود کی خُدائی ہے؟
جِس کو دیکھو وہی ملال میں ہے۔

اس سے دامن بچاؤ تم شیدؔا
آج وہ شخص اشتعال میں ہے

غزل

نعمتِ زیست کو گنوا بیٹھے
عشق میں ایسی چوٹ کھا بیٹھے

شبِ فرقت میں جو سہارا تھا
ہم تو وہ دیپ بھی بجھا بیٹھے

چھوڑ کر زندگی کی راہوں کو
موت کے ہم قریب آبیٹھے

اک تری آرزو کے رستے میں
زخم کھاتے رہے سدا بیٹھے

کون ہیں کس طرف سے آئے ہیں
عشق میں یہ بھی ہم بھُلا بیٹھے

ہم پہ ہنستا ہے یہ جہاں شیدآ
دیکھ ہم خود کو کیا بنا بیٹھے

غزل

نہیں ہے کوئی کہیں راستہ نجات کا بھی
کروں گا لے کے بھلا کیا میں کائنات کا بھی

فقیہہ شہر بھی تلوار کھینچ لایا ہے
لِکھا مٹا نہیں سکتا میں اپنے ہاتھ کا بھی

میں کیا کروں مُجھے اپنی انا کا پاس بھی ہے
بھرم ذرا مُجھے رکھنا ہے اُس کی بات کا بھی

فضا میں گونج رہی ہے صدائے لااِلہ
کُھلا ہوا ہے درِ بند سومنات کا بھی

مِرے خلاف ہیں اھلِ جہاں بھی صف آرا
مجھے تو سامنا رھتا ہے اپنی ذات کا بھی

ہے قرض مُجھ پہ مِرے خاندان کا شیدؔا
تقاضا مُجھ سے ہے کچھ دورِ حادثات کا بھی

غزل

یہ نہ پوچھو کہ رنگ و بُو کیا ہے
ورنہ پھولوں کی آبرو کیا ہے

لمحہ لمحہ تری طلب کیسی؟
ہر گھڑی تیری جستجو کیا ہے

سامنے اُس حسیں فسُوں گر کے
جام کیا چیز ہے ، سبُو کیا ہے

بس وہی خوبرُو ہے بستی میں
دوسرا کوئی خوبرو کیا ہے

یہ جو سمٹا ہے دہر نقطے میں
میری آنکھوں کے رُو برُو کیا ہے

ایک خوشبو ہے اور اس کے سوا
اُن کا اندازِ گفتگو کیا ہے

ایک محدود زندگی کے لیے
دوستو ساری ہاؤہو کیا ہے

آ گئے ہیں تمہاری چوکھٹ پر
بھول بیٹھے ہیں آرزُو کیا ہے

غزل

پھر مجھ کو یاد آئے زمانے وفاؤں کے
تازہ ہوئے ہیں زخم پھر اُن کی جفاؤں کے

نکلی نہیں ہے ناؤ بھی گرداب سے مگر
پڑنے لگے ہیں پھر سے تھپیڑے ہواؤں کے

اِک دھوپ بن کے پھر وہ خیالوں پہ چھا گئے
ہم منتظر تھے جن کی گھنی تیز چھاؤں کے

گلشن میں کوئی پھول نہ مہکے گا اب کبھی
بتلا رہے ہیں ہم کو یہ تیور فضاؤں کے

شیداؔ ہمیں نہ دید کی خیرات اُس نے دی
جس کے لئے لٹائے خزانے وفاؤں کے

غزل

پھر تو ممکن ہے کہ کانٹوں کو بھی خوشبو کر لُوں
میں گزشتہ کو اگر دل میں ترازو کر لُوں

کب کسی اور میں سِمٹا کبھی سُورج کا وجود
کِس طرح اپنے خدوخال میں جگنو کر لُوں

اک یہی گردشِ حالات کی ضد ہے مُجھ سے
زیست کی آخری اُمید بھی آنسو کر لُوں

کس طرح وقت کی ترتیب بدل سکتی ہے
کس طرح تلخئی اَیام کو قابو کر لُوں

کیا کہا ؟ پھینک دوں ہاتھوں سے قلم اے شیدؔا
کیا کہا؟ دشنہ و خنجر کو میں بازو کر لُوں

غزل

سینے کی اے گھُٹن لبِ اظہار تک چلیں
سائے کی جُستجو میں ذرا دار تک چلیں

ممکن جو ہو سکے تو ذرا دیر کے لئے
خود سے نِکل کے کوچہء دلدار تک چلیں

اِس کے بغیر دھوپ سے بچنا محال ہے
جیسے بھی اب ہو سایہء دیوار تک چلیں

دامن میں کیا ہے شیدؔا سوائے خلوص کے
چلنے کو ہم بھی دوستو بازار تک چلیں

غزل

شبِ ستم سے ذرا روشنی نکلتے ہی
بدل گئے سبھی موسم ، چراغ جلتے ہی

مِلا نہ کوئی نشاں مجھ کو اپنے ہونے کا
میں خُود بھی ڈھل گیا سایہ بدن کا ڈھلتے ہی

ہزاروں مِیل ہوئیں دُور منزلیں مجھ سے
رہِ طلب میں کوئی ہمسفر بدلتے ہی

نہ جانے کون سے لمحے میں جی رہا تھا میں
میں ڈگمگانے لگا وقت کے سنبھلتے ہی

عجیب ہونے لگی کیفیت مِرے دل کی
عجیب آگ سی بھڑکی نظر مچلتے ہی

اے شیؔدا گھیرنے لگتی ہے پھر اُداسی مجھے
مِری اُداس طبیعت ذرا سنبھلتے ہی

غزل

شبِ بے نور سے رہائی کا
کوئی لمحہ نہیں بھلائی کا

عمر بھر زہر ہی میں پیتا رہا
تیری فرقت تری جدائی کا

ہم لُٹا آئے جان تک لیکن
زعم ٹوٹا نہ بے وفائی کا

مجھ پہ برسے جو طنز کے پتھر
ہم زباں وہ بھی تھا خدائی کا

کون سمجھائے اُس کو اے شیداؔ
بُرا انجام ہے بُرائی کا

غزل

شبِ فرقت وصال ہو جائے
زندگی بے مِثال ہو جائے

کیسے ممکن ہے تیری فرقت میں
دِل کی دھڑکن بحال ہو جائے

کیا قیا مت ہے اِنتظار کا پَل
عرصہء ماہ وسال ہو جائے

وہ جو لوٹ آئے اس خرابے میں
وحشتِ دل کمال ہو جائے

جب کرے وار یہ فلک شیدؔا
یہ زمیں میری ڈھال ہو جائے

غزل

شیدا جو مرے درد سے انجان بنا تھا
اِک عمر مرے ساتھ مرے گھر میں رہا تھا

میں خاک ہوا جس کی تمنا میں جہاں میں
وہ ایک زمانہ مرے ہمراہ چلا تھا

آنکھوں میں اُتر آیا تھا اِک دشت جنوں کا
جب پیشِ نظر آئینہ بادِ صبا تھا

کچھ زخم تھے کچھ اشک تھے دامانِ طلب میں
یہ پیار کا حاصِل تھا وفاؤں کا صِلہ تھا

شیداؔ اُسے آیا نہ کبھی عہد نبھانا
جو وعدہ کِیا میں نے اُسے پورا کِیا تھا

غزل

وعدہ کرکے وہ جب نہیں آتا
ہم کو پھر بھی نہیں یقیں آتا

شعر ہوتا نہیں، خیالوں میں
کوئی جب تک نہیں حسیں آتا

گھر میں اِک پل نہ تیرگی رہتی
لوٹ کر گر وہ مہ جبیں آتا

جب وہ ہوتے ہیں بدگماں ہم سے
دُوسرا سانس بھی نہیں آتا

زندگی بھر یہی رہی حسرت
کوئی تو لمحہء حسیں آتا

مِل کے شیؔدا سے دیکھ لینا تم
اُس کو رونا کبھی نہیں آتا

غزل

وہ نہ آئے تو اُن کی یاد آئی
جِن کا شَیدا ہُوا ہے شیدائی

بحرِ اُلفت سے ڈر نہیں لگتا
میں نے دیکھی ہے اِسکی گہرائی

اُن کو دیکھا ہے جب سے بے پردہ
میری بڑھنے لگی ہے بینائی

اُن کی محفل نے کر دِیا پاگل
اب تو ڈسنے لگی ہے تنہائی

ہوش باقی نہیں رہے میرے
اُس نے آنکھوں سے اِتنی پلوائی

یہ تماشا بھی خوب ہے شیداؔ
اُن کی شہرت ہے میری رُسوائی

غزل

ٹُوٹ جاتا ہے زندگی کا جام
ہے فقط عشق کا یہی انجام

گھیر لیتے ہیں مجھ کو خوف عجیب
جب اُترتی ہے میرے گھر میں شام

لڑ کھڑانے لگی ہے میری حیات
ہوسکے تو اے دوست مجھ کو تھام

جب سے دیکھا ہے اک نظر تجھ کو
میں نے رکھا ہے عشق اپنا نام

ایک پل کے لئے چلے آؤ
ٹوٹ جائے نہ زندگی کا جام

میں تو زندہ ہوں اس لئے شیدؔا
آئے گا پیار کا کبھی پیغام

غزل

یہ کوئی زندگی ہے تیرے بغیر
ہر طرف تیرگی ہے تیرے بغیر

ہے شبِ تار کی طرح مجھ کو
جس قدر روشنی ہے تیرے بغیر

ہو گئی ہے طویل راہِ طلب
ہر قدم بے بسی ہے تیرے بغیر

زندگی کے حسین موسم میں
کس قدر بے کلی ہے تیرے بغیر

تجھ کو کھونا ہے حشر اے شیدؔا
اور اجل زندگی ہے تیرے بغیر

غزل

ہے مرد جو میداں میں بے خوف و خطر جائے
وہ مرد نہیں ہے جو میدان میں ڈر جائے

وہ تیر نہیں ہے ، جو دِل میں نہ اُتر پائے
ہے تیر وہی جو کہ سینے میں اُتر جائے

جاؤں تو کہاں جاؤں بچ کر تری نظروں سے
موجود اُدھر تُو ہے جِس سِمت نظر جائے

تیرے ہی سبب میری آنکھوں میں چمک آئی
تُو دُور ہو نظروں سے تو نُورِ نظر جائے

شیؔدا تری دُنیا بھی ہے کیسی عجب دُنیا
"جو خندہ بہ لب آئے وہ خاک بسر جائے"

غزل

یہ آرزو ہے صبا پھر سے ایک بار چلے
چمن کی بکھری ہوئی زُلف کو سنوار چلے

جنہوں نے باغ میں کانٹوں سے دوستی کی تھی
وہ کر کے اپنے ہی دامن کو تار تار چلے

میں ان کے بارے میں تو جانتا نہیں کچھ بھی
وہ کس دیار سے نکلے، وہ کس دیار چلے

جو اُٹھ کے بزم سے میری گئے خفا ہوکر
تو اپنے حُسن کو کچھ اور ہی نکھار چلے

فنونِ حرب جنہیں میں نے ہی سکھائے تھے
وہ میرے سینے میں ہی تیر سب اُتار چلے

ترے بغیر چمن دشت لگ رہا ہے مجھے
"چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے "

جو اپنے عہد سے یکسر مکر گئے شیداؔ
وہ لوگ توڑ کے اپنا ہی اعتبار چلے

غزل

چھا رہی ہیں موسمِ دل پر گھٹائیں شام سے
ڈر رہا ہوں اے محبت میں ترے انجام سے

اس کا مطلب ہے ترے سانچے میں آخر ڈھل گیا
مجھ کو دیتی ہے صدا دنیا جو تیرے نام سے

جب سے نکلا ہوں تری جانب رہِ اُمید پر
ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں رنج و غم کے دام سے

جب بھی آتا ہے دسمبر کا مہینہ لوٹ کر
جھانکتا ہے چاند اکثر مجھ کو تیرے بام سے

ہے یقیں مجھ کو مرا جو حوصلہ زندہ رہا
میں نکل آؤں گا شیدؔا گردشِ ایام سے

غزل

حبس پھیلا ہے یوں فضاؤں میں
سانس آتا نہیں ہواؤں میں

لفظ ہیں جیسے دشنہ و خنجر
ہے عجب زہر ساصداؤں میں

یہ برستے ہوئے شرر کیا ہیں
آگ کس نے بھری گھٹاؤں میں

ہر طرف زندگی کے میلے تھے
جن دِنوں میں مَیں تھا گاؤں میں

کھینچ لیتی ہیں جسم سے جاں تک
کیا اثر ہے تری اداؤں میں

کون بدلے گا وقت کی ترتیب
اب کہاں وہ اثر دعاؤں میں

تُو نے کیا پھیر لی نظر شیداؔ
زندگی گھِر گئی بلاؤں میں

غزل

ہمارے پاس ہے جو کچھ بھی وہ ہمارا نہیں
ترے بغیر زمانے میں کچھ گوارا نہیں

پڑی ہے جب کوئی افتاد ایک تیرے سوا
کسی کو اپنی مدد کے لئے پکارا نہیں

اے آسمانِ طلب تُجھ کو کچھ خبر بھی ہے
اک آبلہ ہے ہتھیلی مِری، ستارہ نہیں

تجھے بھی مُجھ سے شکائیت ہے بے وفائی کی
ترے بغیر تو اک سانس بھی گزارا نہیں

اِس اشکِ غم کی روانی کا کیا کہوں شیداؔ
یہ ایسی موج ہے جس کا کوئی کنارا نہیں

غزل

ہاتھ گرچہ یہ کٹ گئے میرے
ہونٹ پھر بھی نہیں سِلے میرے

کی زمانے نے لاکھ سنگ زنی
ٹوٹ پائے نہ حوصلے میرے

اس یقیں پر سفر میں ہوں اک دِن
جگمگائیں گے راستے میرے

کوئی جُگنو کوئی ستارہ ہُوا
اشک جِتنے بھی گِر پڑے میرے

جب بھی مخدوش ہوں مرے حالات
کام آئے ہیں ضابطے میرے

دیکھنا ایک دن زمانے میں
پھیل جائیں گے سِلسلے میرے

میں زمیں زاد ہُوں مگر شیدؔا
ہیں فلک سے بھی رابطے میرے

غزل

ہیں جس کے تذکرے اُس آسماں پر
میں ایسا حرف ہُوں لوحِ جہاں پر

کوئی پیغام بھیجو آندھیوں کو
میں موجِ عکس ہوں ریگِ رواں پر

کہاں ہوں میں اکیلا ہی پریشاں
پریشاں ہے جسے دیکھو یہاں پر

عجب اک خوف سا چھایا ہُوا ہے
تمہارے بعد اس میرے مکاں پر

اجل کی سمت ہوں شیدؔا سفر میں
سواری کر کے میں عمرِ رواں پر

غزل

حصارِ ذات سے نکلوں تو کوئی بات کروں
کبھی شکست سے نکلوں تو اُن کو مات کروں

کہیں نہ چھوڑا مجھے اُن کی چشمِ قاتل نے
میں اُس نظر سے بچُوں تو کسی سے بات کروں

ابھی تو ہستی و پستی کے حادثات میں ہوں
بیاں میں کیسے محبت کے حادثات کروں

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کس طرح آخر
تمہاری ذات میں مدغم میں اپنی ذات کروں

تمہارا غم ہے کہ ناراض ہونے لگتا ہے
بیاں زمانے کے جس دم میں حادثات کرُوں

کرُوں میں کون سی تدبیر آخرش شیداؔ
میں کیسے صبح کی صُورت یہ کالی رات کرُوں؟

غزل

اک نئے آزار سے ڈرتا ہوں میں
پیار کے اظہار سے ڈرتا ہوں میں

بے غرض اس واسطے ہوں اب تلک
خستہ سی دیوار سے ڈرتا ہوں میں

اب کسی کا بھی بھروسا ہے نہیں
دوست سے اغیار سے ڈرتا ہوں میں

خنجر و تلوار کا ڈر کیا مجھے
حرف کی تلوار سے ڈرتا ہوں میں

ہر کوئی مومن ہے شیداؔ اس جگہ
اپنے ہی کردار سے ڈرتا ہوں میں

غزل

دین تھی چونکہ تمہاری زندگی
میں نے ڈر ڈر کے گُزاری زندگی

ایسے لگتا ہے ، ابھی آئے ہیں ہم
خواب تھی گویا یہ ساری زندگی

جان ہی پائے نہ ہم تو عمر بھر
تھی ہماری یا تمہاری زندگی

ہم نہیں بِن مول جنت میں چلے
موت تری قِسط اُتاری زندگی

عقل نے پوچھا ہو کب تک انتظار
کہہ اُٹھا یہ عشق، ساری زندگی

زندگی اُس پر نہ گر قربان ہو
تو گئی بیکار ساری زندگی

راحتوں نے صرف دِیں بدنامیاں
درد نے آکر سنواری زندگی

آخرش مجھ کو سبق حاصل ہوا
موت جیتی اور ہاری زندگی

اُس نے جاتے جاتے ہولے سے کہا
بخش دی شیداؔ تمہاری زندگی

غزل

لُٹا کے اپنا سبھی چین اور قرار چلے
تمہاری بزم سے ہم ہو کے اشکبار چلے

غمِ جُدائی کا یہ درد بھی عجب ہے دوست
مثالِ تیغ سدا دل کے آر پار چلے

وہ لوگ زعم تھا تم پر بڑے غضب کا جنہیں
تمہارے شہر سے بہت ہو کے اشکبار چلے

سمیٹنے کو چلے تھے جو ذات کے ٹکڑے
وہ لے کے دامنِ اُمید تار تار چلے

تری تلاش میں نکلے ہیں جس گھڑی ہم بھی
ہمارے ساتھ ہر اِک گام پر بہار چلے

تمہارے آنے کے ہم منتظر ہیں برسوں سے
"چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے"

وہ پھول جن کا چمن میں نہ تھا کوئی ہمدرد
ہم اپنے خون سے اُن کا بدن نکھار چلے

یہی بہت ہے ہمارے لئے محبت میں
تمہاری اُلجھی ہوئی زُلف کو سنوار چلے

ثباتِ حُسن ہمارے ہی دم سے ہے شیؔدا
ہمارے دم سے محبت کا کاروبار چلے

غزل

یہ بھی اِک معجزہ نہ ہو پایا
زخم دل کا ہرا نہ ہو پایا

وہ جو اِک قرض تھا محبت کا
ہم سے وہ بھی ادا نہ ہو پایا

تنگ دستی میں بھی کوئی جذبہ
باعثِ التجا نہ ہو پایا

درد ان سے ملا سدا لیکن
ان سے کوئی گلہ نہ ہو پایا

شبِ فرقت میں لاکھ چاہا مگر
اشک ہم سے دیا نہ ہو پایا

لاکھ خوشیوں میں ڈھل کے دیکھ لیا
درد تیرا جدا نہ ہو پایا

جس پہ شیدؔا رہا میں اِک مُدت
مجھ سے اُس کا بُرا نہ ہو پایا

غزل

درد تیرا نکل گیا کیسے
دل کا موسم بدل گیا کیسے

کس نے تھاما ہے مجھ کو گرتے ہوئے
کھا کے ٹھوکر سنبھل گیا کیسے

وہ تو سایہ مرے بدن کا تھا
دُور مجھ سے نکل گیا کیسے

کیسے راس آگئی اُسے دنیا
اس پہ جادو یہ چل گیا کیسے

وہ تو اک کہکشاں کی صورت تھا
صورتِ مہر ڈھل گیا کیسے

مجھ کو حیرت ہے میری آہوں سے
ایک پتھر پگھل گیا کیسے

اس کے ہاتھوں میں تھی کمان شیدؔا
تو تیر پھر دل پہ چل گیا کیسے

غزل

یوں غمِ دہر کا جواب دیا
ہم نے ہر سانس کا حساب دیا

کس نے رکھّا ہمیں اندھیروں میں
کس نے صبحِ یقیں کا خواب دیا

ایک پل کی خوشی کی حسرت نے
زندگی بھر کا اضطراب دیا

جس پہ انسانیت ہے نوحہ کناں
ہم نے بچوں کو وہ نصاب دیا

درد جو بھی دیا ہمیں شیداؔ
اس محبت نے بے حساب دیا

غزل

جس طرف بھی میں جاؤں ڈر جاؤں
چھوڑ کر تیرا در کدھر جاؤں

پیار کی تُو جو اِک نظر دیکھے
کیا عجب ہے کہ میں سنوّر جاؤں

تیرے ماتھے پہ جب شکن آئے
رنج و الام سے میں بھر جاؤں

آ مرا ہاتھ تھام لے اے دوست
اِس سے پہلے کہ میں بکھر جاؤں

بیٹھ جاتی ہے دھوپ شاخوں پر
جب بھی میں جانبِ شجر جاؤں

شدّتِ ہجر میں یہ ممکن ہے
شیداؔ میں جان سے گزر جاؤں

غزل

دل کی وحشت کا کیا کیا جائے
بجھتی حسرت کا کیا کیا جائے

عمر بھر بے قرار رکھتی ہے
اِس محبت کا کیا کیا جائے

وہ ملیں گے بروزِ حشر مجھے
اب قیامت کا کیا کیا جائے

جب طبیعت رہے اُداس اُداس
رنگ و راحت کا کیا کیا جائے

پھونک ڈالا ہے جس نے بستی کو
اِس عداوت کا کیا کیا جائے

کیا کیا جائے، کچھ بتا شیدؔا
اُن کی نفرت کا کیا کیا جائے

غزل

وہ جو حرف حرف اُجال دے
مجھے فن میں ایسا کمال دے

میں چراغِ صبحِ نوید ہوں
مجھے ظلمتوں سے نکال دے

کوئی ایسا معرکہ سر کروں
یہ زمانہ میری مثال دے

میں بھٹک گیا ہوں اِدھر اُدھر
مجھے میری سمت اُچھال دے

یہ جو وسوسے ہیں جو وہم ہیں
مرے دِل سے مولا نکال دے

تُو جو چاہے آنکھ جھپکتے ہی
مجھے موجِ درد اُچھال دے

مجھے شیداؔ بس یہی ڈر ہے اب
کہیں کل کے وعدے پہ ٹال دے

غزل

سب رنگ ترے درد کے تحریر میں لاکر
بیٹھا ہوں غمِ جاں کی میں تصویر بنا کر

دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں دوستو سو بار
دیکھا ہے درِ شاہ کی زنجیر ہلا کر

چمکی نہیں اُمید کی اِک آدھ کرِن بھی
دیکھا ہے شبِ غم میں بہت خون جلا کر

وہ درد کی شدّت ہے شبِ ہجر میں اَب کے
آنسو بھی پلٹ جائے مری آنکھ میں آ کر

سمجھا تھا میں جِس شخص کو قسمت کا ستارہ
شیداؔ وہ گیا پیار کے سب دیپ بجھا کر

غزل

ساحلوں سے اُدھر گیا وہ بھی
موجِ غم میں اُتر گیا وہ بھی

راس آئی نہ اُس کو بھی دنیا
ریزہ ریزہ بکھر گیا وہ بھی

وہ جو ارماں تھا دھڑکنوں کا سبب
میرے سینے میں مر گیا وہ بھی

جِس سے رونق تھی بزمِ ہستی میں
آنکھ اشکوں سے بھر گیا وہ بھی

حاصلِ عمر وہ جو لمحہ تھا
مجھ کو چھو کر گزر گیا وہ بھی

غم کی تنہائیوں میں میری طرح
اپنے سائے سے ڈر گیا وہ بھی

جس کو شیدآ سمجھے تھے اپنا
پانیوں میں اُتر گیا وہ بھی

غزل

جِس نے ظلمات سے نکالا ہے
یہ تو اِک حرف کا اُجالا ہے

وہ مرا حوصلہ ہے جِس نے مجھے
گردشوں سے سدا نکالا ہے

راہِ الفت میں جب بھی گرنے لگا
تیری اُمید نے سنبھالا ہے

وہ جو بیٹھا ہے کٹ کے دنیا سے
بس وہی شخص اللہ والا ہے

میں محبت میں اُس جگہ ہوں جہاں
ہر طرف روشنی کا ہالہ ہے

اپنی پہچان کے لیے شیدؔا
تیرے سانچے میں خود کو ڈھالا ہے

غزل

ہم نے جس کا سدا خیال کیا
عمر بھر اس نے پائمال کیا

آ گئی دل کی بات ہونٹوں پر
جراتِ عشق نے کمال کیا

اُن کے ماتھے پہ بل پڑے لاکھوں
جب بھی اُن سے کوئی سوال کیا

آخر اس دل کی بے قراری نے
لمحہٗ ہجر کو وصال کیا

دسترس میں ہے جسکی دل شیداؔ
اُس نے دھڑکن کو کب بحال کیا

غزل

آنکھیں بدل گئیں کبھی چہرہ بدل گیا
تھوڑی سی دور چل کے وہ رستہ بدل گیا

پہلی سی وہ مہک ہے نہ پہلے سے رنگ ہیں
تجھ سے بچھڑ کے زیست کا نقشہ بدل گیا

شائد مرے نصیب میں لکھا تھا ڈوبنا
موجوں نے جب اُچھالا کنارہ بدل گیا

دیکھا جو اُس نے ایک نظرِ التفات سے
میرے نصیب کا تو ستارہ بدل گیا

جب مجھ سے ہم کلام ہوا شیدؔا وہ حسین
پھر دیکھتے ہی دیکھتے لہجہ بدل گیا

غزل

ہر گھڑی اضطراب میں رکھّا
اُس نے مجھ کو عذاب میں رکھّا

مر گیا مرتے مرتے ہر ارماں
دل خانہ خراب میں رکھّا

تجھ کو پانے کی اِک خلش نے دوست
عمر بھر مجھ کو خواب میں رکھّا

آخر کار وہ بھی سوکھ گیا
پھول تھا جو کتاب میں رکھّا

٥

زخم کتنے لگے محبت میں
کب کسی کو حساب میں رکھّا۔!؟

اُسکو بھی شیدآ کردیا حیراں
خود کو بھی پیچ و تاب میں رکھّا

غزل

صورتِ شیشہ ٹوٹ جانے سے
کوئی شکوہ نہیں زمانے سے

مٹ گئے جب سے نقشِ پا تیرے
دھول اُڑتی ہے آشیانے سے

کیا عجب ہے بہار میں بھی یہاں
پھول کھلتے نہیں کھلانے سے

آدمی ہلکا پھلکا رہتا ہے
اک فقط نیکیاں کمانے سے

ظلمتوں کا حصار ٹوٹے گا
پیار کی مشعلیں جلانے سے
اشک آنکھوں میں جم گئے شیداؔ
خالی دامن ہوا خزانے سے

غزل

ہر قدم پر فریب کھاتے رہے
شدتِ ضبط آزماتے رہے

لاکھ روکا ہمیں جہاں نے مگر
اُن کی گلیوں میں آتے جاتے رہے

ہم نے اُن کو سدا سنبھالا دیا
جو ہمیں ٹھوکریں لگاتے رہے

اس محبت میں آئینوں کی طرح
ہر گھڑی ہم تو ٹوٹ جاتے رہے

رنج و آلام زندگی شیدآ
ہر قدم حوصلہ بڑھاتے رہے

غزل

درد کے ماہتاب پھیل گئے
ہر کرن پر عذاب پھیل گئے

ہر خوشی کو نگل گئیں موجیں
غم سرِ سطحِ آب پھیل گئے

اُس نے دیکھا تو اس بجھے دل میں
کس قدر آفتاب پھیل گئے

کیا کرے گی اکیلی خاکِ بدن
ہر طرف جب چناب پھیل گئے

ایک تعبیر کیلئے شیداؔ
کتنے آنکھوں میں خواب پھیل گئے

غزل

درد کی روشنی بجھانے سے
اُٹھ گیا پیار اس زمانے سے

یاد رہتے ہیں دوستوں کو دوست
اے مرے یار آنے جانے سے

اشک آنکھوں میں آنے لگتے ہیں
تیری فرقت میں مسکرانے سے

کیا کہوں کس لئے پرندوں کو
خوف آتا ہے آشیانے سے

حشر برپا ہوا ہواؤں میں
اک دیا پیار کا جلانے سے
جلنے لگتے ہیں جسم و جاں شیدؔا
اُن کے تھوڑا قریب آنے سے

غزل

بس یہی ایک کام کرتے ہیں
ہم محبت کو عام کرتے ہیں

تُو ملا ہے تو آتے جاتے ہوئے
لوگ اکثر سلام کرتے ہیں

اپنے دامن میں جو بھی ہے موجود
آج سے تیرے نام کرتے ہیں

ہونے لگتا ہے اِک جہاں آباد
ہم جہاں بھی قیام کرتے ہیں

دن گزرتا ہے تیرے کوچے میں
تیری گلیوں میں شام کرتے ہیں

جیسے ممکن ہو آدمیت کا
شیداؔ ہم احترام کرتے ہیں

غزل

ہے شبِ تیرگی پہ چھایا ہوا
اک دیا پیار کا جلایا ہوا

میں تھا زلفوں کی چھاؤں سے پہلے
شدتِ دھوپ میں نہایا ہوا

جس طرف سے ہمیشہ درد ملے
دل اُسی سمت ہے لگایا ہوا

ایک میں ہی نہیں محبت میں
ہر بشر نے ہے زخم کھایا ہوا

کیا کہوں اس نے ساتھ کیوں چھوڑا
جانے کیوں مجھ سے وہ پرایا ہوا

وہ بھی دنیا کا ہو گیا شیدؔا
پیار تھا جس کا آزمایا ہوا

غزل

یہ بھی ہے دوستو کمال اُس کا
ہم نہ بھولے کبھی خیال اُس کا

ہجر اُس کا ہے موت کی صورت
صورتِ زیست ہے وصال اُس کا

آج بھی جسم وجاں جلاتا ہے
رنج اُسکا، کبھی ملال اُس کا

یہ بلندی ہے آخری زینہ
اِس سے آگے ہے بس زوال اس کا

سانس لینا عذاب ہو جائے
درد سینے میں یوں نہ پال اُس کا

اور ناراض ہوتا ہے شیداؔ
پوچھتا ہوں جو حال چال اُسکا

غزل

لمحہ لمحہ رہینِ یاس رہا
تجھ کو کھو کر بہت اُداس رہا

عمر بھر رنج و غم اُٹھا کر بھی
مجھ کو اِس عاشقی کا پاس رہا

دکھ تو یہ ہے بھری بہاروں میں
آرزو کا کنول اُداس رہا

اس جہانِ بُتاں میں رہتے ہوئے
مجھ سا عاصی خدا شناس رہا

کر کے تسخیر ساری دنیا کو
آدمی تشنۂ لباس رہا

افرا تفری میں یوں کٹی شیدؔا
عمر بھر جیسے بدحواس رہا

غزل

خود کو جب اُن پہ مہربان کیا
ساری دنیا کو بدگمان کیا

ڈال کے سر پہ پاؤں کی مٹی
ہم نے دھرتی کو آسمان کیا

ورنہ کب ہم کو کوئی جانتا تھا
اِس محبت نے داستان کیا

ہم وہ درویش ہیں جنھوں نے سدا
دھوپ کو اپنا سائبان کیا

ہم نے اس شہرِ بے اماں میں سدا
خود کو اپنے لئے امان کیا

اپنی ہمّت سے ہم نے شیدؔا جی
مثلِ گلشن یہ خاکدان کیا

غزل

ناخدا آپ کے اشارے پر
کون اُترا بھلا کنارے پر

ہم نے جیون بتا دیا سارا
رقص کرتے ہوئے شرارے پر

زندگی اپنی جی رہے ہیں ہم
اب کسی اور کے سہارے پر

ہم نے کھولی دوکانِ دل جب تک
وقت ٹھہرا رہا خسارے پر

آج کے آدمی نے پھینک دیا
آدمیت کو مٹی گارے پر

کھول دیتا ہے وہ قفس شیدا
کاٹ لیتا ہے جب ہمارے پَر

غزل

جب ہوئے ہیں ترے خیال کے ہم
شعر کہنے لگے کمال کے ہم

دامنِ وقت سے پلٹ آئے
لے کے لمحے ترے وصال کے ہم

ہو گئے ہیں دھمال کے یکسر
معجزے دیکھ کے دھمال کے ہم

اُڑتے پھرتے ہیں آسمانوں میں
تیرے سانچے میں خود کو ڈھال کے ہم

ایک لمحے کی اس جدائی میں
ہوگئے کتنے ماہ و سال کے ہم

کب ہوا معترف جہاں شیدآ
کب ہوئے ہیں تری مثال کے ہم

غزل

وہ ہم سے انجان بہت ہے
دل اپنا ویران بہت ہے

عشق کے کھیل کو کھیل کے جانا
اس میں تو نقصان بہت ہے

حسرت حسرت سرکش ٹھہری
بگڑا ہر ارمان بہت ہے

عمر گزاری کے لئے جاناں
پیار کا اک پیمان بہت ہے

تجھ کو مبارک محل منارے
ہم کو اپنی آن بہت ہے

مشکل شیدؔا شوق سے آئے
میرے بدن میں جان بہت ہے

غزل

ڈوبتا دل سنبھالنے سے رہے
دھڑکنوں کو اُجالنے سے رہے

دُور تک اِک گھٹن ہے ایسے میں
دل کی حسرت نکالنے سے رہے

اپنے ہاتھوں سے خود کو گرتے ہوئے
یہ مسافر سنبھالنے سے رہے

رزق کی جستجو میں اُلجھے ہوئے
گردشِ وقت ٹالنے سے رہے

خاک میں خاک ہونے والے لوگ
آسماں کو کھنگھالنے سے رہے

عمر گُزری ہے اپنی روتے ہوئے
اِک نیا روگ پالنے سے رہے

حاصلِ زندگی ہے یہ شیدؔا
غم پہ ہم خاک ڈالنے سے رہے

غزل

دھڑکنیں بن کے کون آیا ہے
کون دل میں مرے سمایا ہے

سُرخرُو اس لئے ہوں دنیا میں
مجھ پہ میرے خدا کا سایہ ہے

کچھ نہیں اور دل کے آنگن میں
اک شجر پیار کا لگایا ہے

کِس کو دیکھا ہے مدتوں کے بعد
کِس نے جذبوں کو پھر جگایا ہے

زندگی بین کرتی پھرتی ہے
آدمی خون میں نہایا ہے
بیٹھے بیٹھے میں چونک اُٹھا شیداؔ
ایک دم کون یاد آیا ہے

غزل

بن گئی ہے مرے دماغ کی لَو
شبِ ظلمات میں چراغ کی لو

چھینتی رہتی ہے ضیائے بدن
ہر گھڑی دوستو فراغ کی لو

دل بُجھا میرا ایسے بارش میں
جس طرح بجھتی ہے ایاغ کی لو

ہم نے پائی نہ منزلوں کی طرف
راستے میں کسی سراغ کی لو

اُس کے آنے پہ پھیلی ہے شیداؔ
ہر طرف شاخ شاخ باغ کی لو

غزل

تجھ کو کھو کر میں ایسے گھر میں رہا
عمر بھر جس طرح سفر میں رہا

میں جہاں بھی رہا زمانے میں
اک ترا در میری نظر میں رہا

دشتِ حسرت میں مدتوں یارو
صورتِ سایہ میں شجر میں رہا

تیرے آنے کی آس میں جاناں
عمر بھر تیری رہگزر میں رہا

کسی مضموم آرزو کی طرح
آسماں میرے بال و پر میں رہا

دل میں اُتری رہی خلش شیدؔا
کوئی سودا سا میرے سر میں رہا

غزل

ضبط ہمیشہ دھیان میں رکھ
لَوٹنے کو امکان میں رکھ

چُپ ہوں میں جو، بات ہے اور
کھُل جانا امکان میں رکھ

گو انسان خسارے میں ہے
وحشت یار گمان میں رکھ

ہو سکتی ہے مشکل راہ
آسانی سامان میں رکھ

کہہ دیا جسکو جو بھی چاہا
خود کو بھی پہچان میں رکھ

شیدآ تہہِ زمین ہے جانا
یہ بھی سوچ اُڑان میں رکھ

غزل

منزل کے ہر نشان سے ہم با خبر ہُوئے
جس دن سے وقفِ سوزشِ خاکِ سفر ہوئے

اس عاشقی نے کشفِ زمانہ کیا مگر
ہم کو یہ زعم تھا کہ بڑے معتبر ہوئے

مِنت کشِ زمانہ نہیں ہم ، یہ جان لو
ہم اِک فقیرِ دل کی دُعا کا ثمر ہوئے

جس دن سے ہم ہوئے یہاں آوارگی پسند
اُس دن سے ہم تو عظمتِ دیوار و در ہوئے

اِک عرصہ ءِ دراز ہُوا میرے حال پر
اُنکی نگاہِ ناز کا حُسنِ نظَر ہوئے

لوٹا نہ پھر بھی تُو کہ ترے انتظار میں
ہم خاک ہوتے ہوئے تری رہ گزر ہوئے

لوٹا ہے جب سے سایہ ہمارے وجود کا
شیدؔا بلا کی دھوپ میں جیسے شجر ہوئے

غزل

عشق میں کاش یہ ہنر آجائے
جب میں چاہوں وہ میرے گھر آجائے

وہ پلٹ آئیں جو مری جانب
زندگی لوٹ کر اِدھر آجائے

جو بھی الزام، جو بھی تہمت ہے
اس محبت میں میرے سر آجائے

کیا عجب فاصلے سمٹ جائیں
کیا عجب تیری رہگزر آجائے

دو جہاں میں وہ سرخرو ٹھہرے
نوکِ نیزہ پہ جس کا سر آجائے

موج مجھ کو اُچھالے جب شیدؔا
درمیاں پھر کوئی بھنور آجائے

غزل

دل جو خالی ہوئے محبت سے
ہو گئے دُور ہم حقیقت سے

عمر اپنی سنبھال رکھی ہے
جذبہء عشق کی ریاضت سے

وقت نے لاکھ آزمائش کی
ہم نہ بدلے تری محبت سے

شاخ در شاخ ہر کلی ہے اداس
پھول محروم ہیں لطافت سے

کسی صورت اُتر نہیں پایا
اک ترا غم مری طبیعت سے

مجھ کو پہچانتا ہے اے شیداؔ
یہ زمانہ تری وساطت سے

غزل

زندگی کو خراب کیوں کرتے
ہم تیرا انتخاب کیوں کرتے

چھوڑ کر ہاتھ ہم حقیقت کا
اپنی ہستی خراب کیوں کرتے

ڈھال کر دِل کو دشت کی صورت
اپنی آنکھیں چناب کیوں کرتے

ہار کر حوصلہ محبت میں
زخمِ دل کا حساب کیوں کرتے

ہو کے رسوا گلی میں اے شیدؔا
آبرو کو خراب کیوں کرتے

غزل

شبِ فرقت میں یار جلتے رہے
عمر بھر بے قرار جلتے رہے

صورتِ دیپ تیری حسرت میں
ہم سرِ رہگزار جلتے رہے

خوں سُلگتا رہا رگ و پے میں
یوں ترے بے قرار جلتے رہے

زندگی بھر دیارِ ظلمت میں
ہو کے بے اختیار جلتے رہے

ایک شعلہ بدن پہ اے یارو
کر کے ہم اعتبار جلتے رہے

شیدؔا ہم پر وہ وقت بھی آیا
بھر کے سینے میں پیار جلتے رہے

غزل

بات سمجھے گا یہ زمانہ کیا
آزمائے کو آزمانا کیا

زندگی چار دن کا میلہ ہے
ایسی عجلت میں دل لگانا کیا

جن کی فطرت ہو پتھروں جیسی
ایسے لوگوں کو غم سُنانا کیا

لڑتے پھرتے ہیں لوگ آپس میں
یہ جہاں ہو گیا دوانہ کیا

اپنے اپنے مفاد کی خاطر
پھونک ڈالو گے آشیانہ کیا

ایک انساں کے واسطے شیدا
ساری دنیا سے روٹھ جانا کیا

غزل

آسماں کب ترے یقین سے ہے
میرا ہونا مری زمین سے ہے

جتنی رونق ہے بزمِ ہستی میں
اک اُسی جلوہء حسین سے ہے

ورنہ اک دشت ہے، کھنڈر ہے یہاں
گھر کا ہونا تو بس مکین سے ہے

جس نے انسانیت کا درس دیا
اپنی نسبت تو اُس ذہین سے ہے

جس قدر ہے چمک دمک شیداؔ
خانہء دل میں مہ جبین سے ہے

غزل

جو روشنی بحال ہے
لہو کا سب کمال ہے

ترے بغیر ہر طرف
زوال ہی زوال ہے

چمک اُٹھے ہیں راستے
یہ کون خوش جمال ہے

ترے بغیر زندگی
وبال ہی وبال ہے

اِدھر اُدھر یہاں وہاں
تری کہاں مثال ہے

زمین پائمال تھی
زمین پائمال ہے

نفس نفس رواں ہے وہ
وصال ہی وصال ہے

یہاں سے شیدؔا کوچ کر
یہاں وفا کا کال ہے

غزل

جب وہ دل سے اُترنے لگتا ہے
وقت جیسے ٹھہرنے لگتا ہے

وہ مجھے دے کے ایک تازہ زخم
اپنے ہی میں سنوّرنے لگتا ہے

صورتِ دھُول میرے سینے میں
دل کا موسم بکھرنے لگتا ہے

اک ترا درد ہے جو اشکوں سے
میری آنکھوں کو بھرنے لگتا ہے

دلِ وحشی کو لاکھ سمجھاؤ
پھر تمہیں یاد کرنے لگتا ہے

آدمی اپنے سائے سے شیدا
بعض اوقات ڈرنے لگتا ہے

غزل

جب سے اُن کی نظر میں رہتا ہوں
بے گھری میں بھی گھر میں رہتا ہوں

جب سے ڈوبا ہوں تیری سوچوں میں
ہر گھڑی مَیں سفر میں رہتا ہوں

جب سے لوٹا ہے جسم کا سایہ
چھاؤں بن کر شجر میں رہتا ہوں

جانے کِس کی ہے دسترس مجھ پر
جانے کِس کے اثر میں رہتا ہوں

ہے عجب اُس کو پا کے بھی شیدآ
ایک انجانے ڈر میں رہتا ہوں

غزل

جب تلک تجھ سے اجتناب کیا
دل نے مجھ کو بہت خراب کیا

سب سے بھاری رہا غمِ جاناں
غمِ دنیا کا جب حساب کیا

آخر کار اس محبت نے
سانس لینا بھی ہے عذاب کیا

کون ہے اس جہاں میں میرے سوا
جس نے تدبیر کو بھی خواب کیا

آزمائش کی ہر گھڑی میں مجھے
میری ہمت نے کامیاب کیا

زندگی چین سے کٹی شیداؔ
پیار کو جس گھڑی نصاب کیا

غزل

گھر کے دیوار و در بدلنے سے
بے اماں ہم ہوئے سنبھلنے سے

زور ٹوٹے گا آندھیوں کا فقط
آرزو کے چراغ جلنے سے

جسمِ انسانیت ہوا پیلا
آستینوں میں سانپ پلنے سے

حوصلے اور بھی ہوئے کمزور
ہر گھڑی اپنے ہاتھ ملنے سے

اک عجب روشنی سی پھیلی ہے
میرے سینے میں دل کے جلنے سے

ہم بھٹکنے سے بچ گئے شیدؔا
چاند تاروں کے ساتھ چلنے سے

غزل

جب سے لوٹا ہوں اپنے گاؤں سے
کوئی نسبت رہی نہ چھاؤں سے

مجھ کو اک بوند بھی نہ مل پائی
جُھومتی ناچتی گھٹاؤں سے

لڑتے لڑتے کٹی ہے عمر تمام
صورتِ دیپ ان ہواؤں سے

باندھ کر گھر سے چل پڑا ہوں میں
منزلوں کا یقین پاؤں سے

میں وہاں ہوں جہاں پہ پڑتا ہے
واسطہ ان گنت خداؤں سے

ابر بن کر وہ شیدؔا کیا آیا
منسلک ہو گیا گھٹاؤں سے

غزل

اس محبت میں چوٹ کھائے ہوئے
عمر گزری ہے مسکرائے ہوئے

اک کونے میں لگ کے بیٹھے ہیں
آرزو سے فریب کھائے ہوئے

منتظر ہے جہاں اُجالو کا
اپنے خوں سے دیئے جلائے ہوئے

وائے قسمت کہ اِک زمانہ ہوا
ان کی جانب قدم بڑھائے ہوئے

آج بننے لگے خدا شیدؔا
بت مرے ہاتھ کے بنائے ہوئے

غزل

رنگ اُسکا ہے روشنی جیسا
وہ مکمل ہے زندگی جیسا

ہونٹ اُسکے ہیں موتیوں کی طرح
اُس کا آنچل ہے چاندنی جیسا

سارے رستوں میں جھانک اور بتا
کوئی رشتہ ہے دوستی جیسا

شاید اس بار ہار جاؤں میں
کھیل کھیلا ہے دل لگی جیسا

اِس زمانے میں ظلم اے شیدؔا
ہم نے دیکھا نہ آدمی جیسا

غزل

راہوں میں پیار کی تم چلتے رہو گے کب تک
دھوپوں میں اِس قدر بھی جلتے رہو گے کب تک

اپنا وجُود رکھو ہر حال میں مناسب
سائے کی مثل ہر دم ڈھلتے رہو گے کب تک

کب تک رہو گے آخر غیروں کی دسترس میں
ہاتھوں کو اپنے آخر ملتے رہو گے کب تک

جینا تو پھر ہے جینا اوروں کے کام آنا
اپنے لئے ہی یارو جیتے رہو گے کب تک

شیدؔا کو کھا گئی ہے اس درد کی تمازت
اُس سے نہ پوچھنا تم جلتے رہو گے کب تک

غزل

اب کے ایسے ترا گماں گزرا
آنکھ سے جیسے آسماں گزرا

جب بھی گزرا ہے وہ اِدھر سے کبھی
صورتِ لمحہ رائیگاں گزرا

مجھ میں یہ کیسی روشنی سی ہے
کِس کا یہ عکس ضوفشاں گزرا

جتنا گُزرا ہے تیری فرقت میں
وقت سارا وہ رائیگاں گُزرا

مجھ کو جلتے ہوئے چراغوں پر
اِک دھُویں کا سدا گماں گُزرا

ایسے گزری ہے وہ کرن اس بار
جیسے اُڑتا ہُوا دھُواں گزرا

جو بدل ڈالے وقت کی ترتیب
کب وہ شیدؔا کہیں جواں گزرا

غزل

وقت ظلمت کا ٹلنے والا ہے
کوئی سورج نکلنے والا ہے

آنے والا ہے اب وہی درویش
وہ جو قسمت بدلنے والا ہے

ٹھوکریں ہر قدم پہ کھاتا ہوا
آدمی اب سنبھلنے والا ہے

میری دھرتی کا ایک اِک ذرّہ
اب خزانے اُگلنے والا ہے

ہم پہ آسیب کا جو سایہ ہے
صورتِ سایہ ڈھلنے والا ہے

منزلیں جن کے انتظار میں ہیں
کارواں اب وہ چلنے والا ہے

غزل

راستوں کے غُبار میں گزری
زندگی انتظار میں گزری

لمحہ لمحہ تھا حشر کی صورت
ہر گھڑی انتشار میں گزری

ایسے گزری ترے فراق میں دوست
عمر جیسے غُبار میں گزری

بے یقینی کے شہر میں اپنی
اِک ترے اعتبار میں گزری

ایک ہم ہیں کہ اپنی ساری حیات
رنج و غم کے حصار میں گزری

شیدؔا پوچھو چمن کا حال اُن سے
جن کی ساری بہار میں گزری

غزل

یہ کیا سازش چمن میں ہورہی ہے
کلی ہر گُل سے مل کے رو رہی ہے

عجب ہونے لگے ہیں سرد جذبے
تمنا دل کی دل میں سو رہی ہے

جسے سمجھے تھے ساعت روشنی کی
رگ و پے میں اندھیرے بو رہی ہے

اُلجھ کر تیری یادوں میں طبیعت
قرار دیدہ و دل کھو رہی ہے

سُخن فہمی کا ہے ادراک جن کو
تمہاری آرزو سب کو رہی ہے

غریبِ شہر کی نو عمر بیٹی
سڑک پر پتھروں کو ڈھو رہی ہے

نئے خورشید کی بے چارگی پر
دیئے کی لو دیئے میں رو رہی ہے

سنبھالو مجھ کو اے شیدؔا سنبھالو
طبیعت میری بوجھل ہو رہی ہے

غزل

غم سے جو آشنا نہیں ہوتے
آدمی باوفا نہیں ہوتے

یہ جو کچھ قرض ہیں محبت کے
زندگی بھر ادا نہیں ہوتے

جلتے رہنا ہے دوستو جب تک
ہم ستارہ نما نہیں ہوتے

توڑ کر پیار کے سبھی بندھن
اتنی جلدی جدا نہیں ہوتے

صورتِ دشت جلتے ہیں شیدؔا
جن کے آنسو گھٹا نہیں ہوتے

غزل

جب سے وہ آبسا ہے آنکھوں میں
پھول کھلنے لگے ہیں سانسوں میں

روشنی رقص کرنے لگتی ہے
تجھ کو سوچوں تو میری سوچوں میں

آنکھوں آنکھوں میں کرگیا جادو
لے گیا دل وہ باتوں باتوں میں

زندگی دیپ بن کے جلتی ہے
ہجر کی ان طویل راتوں میں

اک عجب کرب سا دکھائی دیا
جب بھی جھانکا کبھی ستاروں میں

لاکھ اہلِ جہاں نے چاہا مگر
کب ہوئی ہے کمی ارادوں میں

چھوڑ کر جو گیا مجھے شیدؔا
یاد آیا اُداس لمحوں میں

غزل

پیار کی بازی جب سے ہاری ہے
سانس لینا بھی اب تو بھاری ہے

میرے قدموں کی دھول نے اُڑ کر
آسماں کی قبا سنواری ہے

داغ لگنے دیا نہ دامن پر
ہم نے یوں زندگی گزاری ہے

ایک لمحہ بھی دسترس میں نہیں
اتنی اوقات بس ہماری ہے

بس وہی عمر تھی کمال کی عمر
جو ترے قرب میں گزاری ہے

یہ کوئی شہر ہے کہ جنگل ہے
جس کو دیکھو وہی شکاری ہے

اُس میں تجھ جیسے پھول ہیں شیدؔا
جس گلستاں سے میری یاری ہے

غزل

درد اور کرب سے گزرنا ہے
پھر تجھے دل نے یاد کرنا ہے

تیرے رستے میں صورتِ خوشبُو
ایک میں ہوں جسے بکھرنا ہے

کہہ رہی ہے چمک یہ پانی کی
جھیل میں چاند کو اُترنا ہے

دل کی صورت ہے صورتِ صحرا
اور مری آنکھ ہے کہ جھرنا ہے

میں جہاں ہوں وہیں سے آخرِ کار
صبح خورشید کو اُبھرنا ہے

رہنماؤں کو بھی نہیں معلوم
کتنا چلنا ہے کب ٹھہرنا ہے

دل میں شیدؔا کا دھیان لے آؤ
آئینے میں اگر سنورنا ہے

غزل

اے مری جانِ جاں تری خاطر
چھوڑا ہے آسماں تری خاطر

صورتِ دشت ہوتا جاتا ہے
دل کا یہ گلستاں تری خاطر

خود جلے دھوپ میں سدا لیکن
بن گئے سائباں تری خاطر

در بدر ہوگیا ہوں دنیا میں
اے مرے مہرباں تری خاطر

سارے رشتوں کو طاق میں رکھا
میں نے اے بدگماں تری خاطر

ہنس کے جھیلا ہے جان پر شیداؔ
ہر کڑا امتحاں تری خاطر

غزل

ستارہ ہے وہ جگنو یا شرر ہے
مرے اندر کوئی محوِ سفر ہے

وگرنہ میں تو ہوں ادنیٰ سا انساں
یہ سارا آپ کا حُسنِ نظر ہے

بدن اِک دشت بنتا جارہا ہے
یہ کس آسیب کا مجھ پر اثر ہے

وہ جس کے خار بھی ہیں پھول جیسے
مرے پیشِ نظر وہ رہگزر ہے

جو پتھر کو بھی چھو کر موم کردے
یہ چاہت کے سوا کس میں ہنر ہے

تمہاری زلف کا سایہ ہے ایسے
سلگتی دھوپ میں جیسے شجر ہے

بس اِک یہ بات شیدؔا پوچھنی ہے
زمانہ ہوگیا ہے تُو کدھر ہے

غزل

وہ کون سا ہے درد جو تجھ سے ملا نہیں
میں تجھ کو بھول جاؤں مگر حوصلہ نہیں

رکھوں تو کس کے سامنے میں دل کا مدعا
تیرے بغیر مجھ کو کوئی جانتا نہیں

کِس سمت جا رہا ہے بھلا کاروانِ شوق
رستوں کی اونچ نیچ کوئی دیکھتا نہیں

ہم ایک دوسرے سے رہیں گے سدا جُدا
یہ تیرا فیصلہ ہے مرا فیصلہ نہیں

دیکھے تو کیسے اپنے خدوخال کی طرف
ہاتھوں میں زندگی کے کوئی آئینہ نہیں

برسوں سے سُن رہے ہیں بہاروں کے تذکرے
لیکن کوئی بھی پھول چمن میں کھلا نہیں

جس پر تھا تو نثار وہی دے گیا دغا
یہ تیرے ساتھ شیداؔ کچھ اچھا ہوا نہیں

غزل

اس محبت میں اب یہ کرنا ہے
ہنس کے ہر درد سے گزرنا ہے

لاکھ منہ زور یہ خزاں ہو جائے
آرزو کا چمن نکھرنا ہے

اک نہ اک روز ان اندھیروں سے
آفتابِ سحر اُبھرنا ہے

جو بھی ممکن ہوا انا کے لئے
ہم نے اس بار کر گزرنا ہے

یہ جو اُلجھی ہوئی ہے زیست کی زلف
اِس کو ہر حال میں سنورنا ہے

راہ حق پر چلا تو مجھ پہ کھُلا
میرا مرنا عدو کا مرنا ہے

کھیل کا فائدہ نہیں شیداؔ
جیت کر بھی تو میں نے ہرنا ہے

غزل

ہر سانس کو بدن سے جدا کردیا گیا
یوں قرض چاہتوں کا ادا کر دیا گیا

صبحِ طلب کا کوئی نشاں کس طرح ملے
سورج کو ظلمتوں نے دیا کر دیا گیا

جب بھی بڑھا ہے دستِ طلب اس سخی کے سمت
ذرے کو آسمان بنا کر دیا گیا

اُس کی طرف سے ہم کو یہ ٹکڑا زمین کا
دامن پہ کتنے داغ لگا کر دیا گیا

تیرہ رتوں کے ساتھ لڑائی کے واسطے
شیؔدا ہر اِک چراغ بجھا کر دیا گیا

نغمہ برائے خصوصی افراد

سب اِک دوسرے کے سہارے بنیں ہم
ہمارے بنو تم ، تمہارے بنیں ہم

مرے ہم سفر راستے سے نہ بھٹکیں
چمکتے دمکتے ستارے بنیں ہم

وطن ہے ہمارا ، ہمی اس کے وارث
کریں اس کی خدمت تو پیارے بنیں ہم

نہ ہو حائل معذوری رستے میں شیؔدا
بڑے عزم کے استعارے بنیں ہم

عدو کی غُلامی و کشکول توڑیں
یوں خود آپ اپنے سہارے بنیں ہم

نغمۂ لاہور

اے شہرِ خُوباں تری خوبیاں گِنواؤں کیسے!
شہرِ لاہور تجھے پلکوں پہ بٹھاؤں کیسے؟

تری مٹی کی خوشبو راس آگئی ہے
اب کسی اور چمن کی آس لگاؤں کیسے؟

تری فضاؤں میں نغمگی اتنی ہے
میں اپنا کوئی گیت گنگناؤں کیسے ؟

تری گلیوں کے مکیں، تیری سرحدوں کے امیں
ان کے جیسا بھری دُنیا میں پاؤں کیسے

نظم

چلو اُس پار چلتے ہیں
جہاں پر دل کی
ہر دھڑکن
ہمیشہ رقص کرتی ہے
کِسی مجذوب کی صورت
جہاں آنکھوں میں رہتی ہے
سدا محبوب کی صورت
چلو اُس پار چلتے ہیں
جہاں لمحہ بہ لمحہ

ہر گھڑی

تازہ اُجالا ہے

جہاں پر روشنی انسان کا

واحد حوالہ ہے

چلو اس پار چلتے ہیں

جہاں پر گردشِ حالات کا

خدشہ نہیں رہتا

جہاں پر زندگی کو

موت کا کھٹکا نہیں رہتا

چلو اُس پار چلتے ہیں

دُواشعار

نہ میں تجھ سے
نہ تُو مجھ سے

ہوئے دونوں
جُدا خود سے
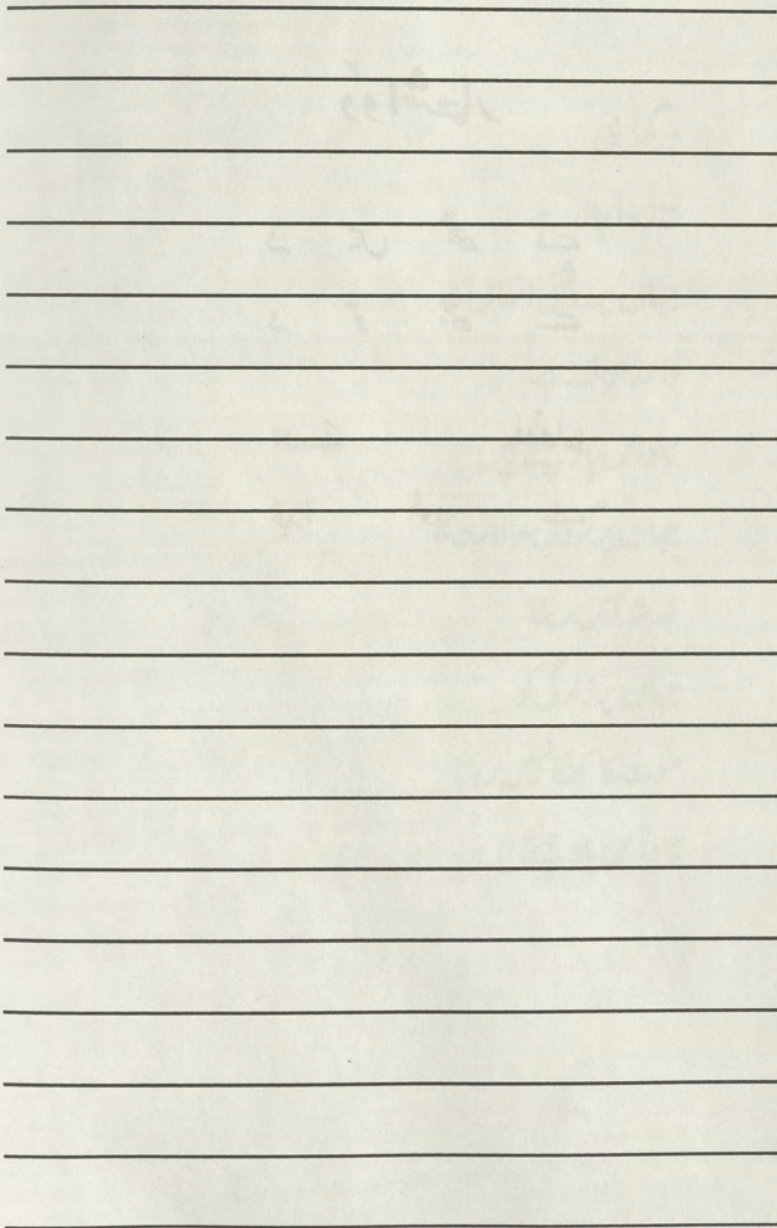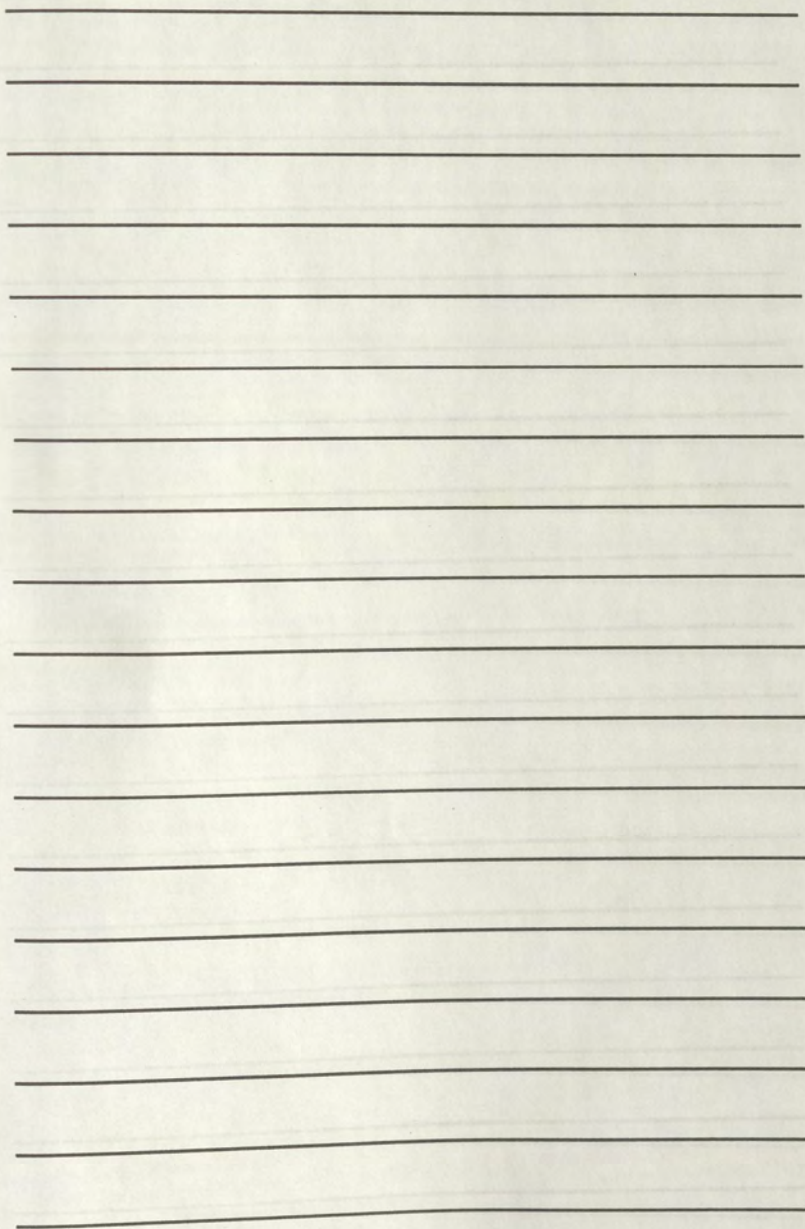
دیگر تصانیف

- دَشتِ شَب (غزلیات)
- گُمانِ یقیں (غزلیات)
- رقصِ آگہی (غزلیات)
- حَرف شناس (مُنتخب کالم)
- قلم گَردُ (یادداشتِ زِیست)
- خاصاں دِی گَلّ (مجموعہ نعت)
- پانی وِچ پتاسا (کافیاں، غزل، گیت)
- حقیقتِ لاہور (تاریخی تحقیق)
- پیا مِلن کی آس (ڈرامہ)
- مُجاب (ناول)
- خاموش مُحبت (افسانہ)

جاوید شیدؔا کا شعری مجموعہ، "گمانِ یقیں" اپنے عنوان ہی سے اپنی پہلوداری کا نقش بٹھا دیتا ہے۔ یہ پہلوداری "گمانِ یقیں سے یقینِ گماں تک" پھیلی ہوئی ہے۔ گل و بلبل اور لب و رخسار سے ماورا، جاوید شیدؔا کا مرکزی موضوعِ سخن انسان اور انسانی اقدار ہیں۔ اُن کا زاویۂ نگاہ مثبت اور رجائی ہے۔ اُن کے خیال میں زیست کی اُلجھی ہوئی زُلف کو ہر حال میں سنورنا ہے اور آندھیوں کا زور توڑنے کیلئے چراغ جلاتے چلے جانا ضروری ہے۔
وہ ظلمت کو ٹلتے اور سورج کو نکلتے دیکھ رہے ہیں۔ اُن کے بقول:

ہم پہ آسیب کا جو سایہ ہے — صورتِ سایہ، ڈھلنے والا ہے
منزلیں جس کے انتظار میں ہیں — کارواں اب وہ چلنے والا ہے

وہ اپنے اندر محوِ سفر کسی جگنو یا ستارے یا شرر کی چاپ سنتے ہیں اور دل کی بے قراری اُن کے ہاں لمحۂ ہجر کو وصال بنا ڈالتی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ "گمانِ یقیں" کو دنیائے ادب میں ضرور وہ پذیرائی حاصل ہوگی جس کا یہ مجموعہ مستحق ہے۔

خورشید رضوی

گمانِ یقیں سے یقینِ گماں تک
رسائی ہے میری کہاں سے کہاں تک

میں اک ایسا ذرہ ہوں اپنی زمیں کا
ہے جس کی رسائی سدا آسماں تک